

انشائیہ

انشائیہ اردو نثر کی نسبتاً جدید صنف ہے۔ ابتدا میں ہلکے پھلکے مضامین کو انشائیہ کے زمرے میں رکھا گیا لیکن رفتہ رفتہ انشائیہ کے خدوخال صنف کے طور پر طے ہوتے چلے گئے۔ اردو میں انشائیہ کی تاریخ صرف 35 سال پرانی ہے۔ مشہور ناقد اور انشائیہ نگار ڈاکٹر جاسن کے الفاظ میں :

’انشائیہ ایک ذہنی ترنگ ہے جس میں بے ترتیب، غیر منضبط اور ناپختہ خیالات اور جذبات کا اظہار ہو۔‘
 کہا جاتا ہے کہ اردو میں انشائیہ کا ظہور مغربی ادبیات کے حوالے سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو انشائیہ نے مغرب کے انشائیوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے دائرہ کار میں بھی کافی وسعت پیدا کی ہے مثلاً یہ کہ انشائیہ میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہونا چاہیے۔ انشائیہ میں کہا لوہیت کفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو انشائیہ عصری شعور کی ترجمانی کرنے کے علاوہ کائناتی شعور کا بھی اظہار کر رہا ہے۔ زمان و مکان کے سوالات بھی انشائیہ میں جگہ پانے لگے ہیں جو ذہنی بلوغیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔



سید محمد حسنین



سید محمد حسنین 2 اکتوبر 1920ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب خانوادہ امام تاج فقیہ سے ملتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے سمٹری اسکول سے میٹرک اور پٹنہ یونیورسٹی سے 1946ء میں ایم۔ اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ 1956ء میں بہار یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے ریاست بہار میں اردو کی پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری لینے کا امتیاز حاصل کیا۔ 1968ء سے 1985ء تک گلدھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس دوران کثرت سے علمی و ادبی مقالات ہندو پاک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ مگر جس کام نے انہیں شہرت اور مقبولیت عطا کی وہ صنف انشائیہ نگاری کے سلسلے میں لکھی گئی ان کی کتاب ہے۔ یہ کتاب 'صنف انشائیہ اور چند انشائیں' کے نام سے پہلی بار 1958ء میں شائع ہوئی اور اس کا چھٹا ترمیم شدہ ایڈیشن 'انشائیہ اور انشائیں' کے زیر عنوان 1997ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب میں محمد حسنین آزاد سے لے کر شفیقہ فرحت تک کل ستائیس انشائیہ نگاروں کے مضامین شامل ہیں۔ ایک مضمون ج۔ م۔ اسلم عظیم آبادی کے نام سے خود سید محمد حسنین کا بھی ہے۔ وہ ابتدا میں اسی نام سے مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس کتاب کے علاوہ انہوں نے تقریباً دو درجن کتابیں لکھی ہیں اور کچھ مفید خاص نمبر لکالے ہیں۔ حسنین صاحب ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد پٹنہ میں رہنے لگے تھے مگر اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کے گھر دہلی، علی گڑھ اور کراچی وغیرہ آتے جاتے رہتے تھے۔ اکتوبر 1999ء میں پاکستان گئے تھے۔ وہیں انتقال ہو گیا اور اسلام آباد میں مدفون ہوئے۔

سید محمد حسنین نے خاکے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ انہوں نے گلدھ یونیورسٹی سے ایک رسالہ 'مضامین' کے نام سے نکالا تھا جس کی ریسرچ کے اعتبار سے اہمیت تھی مگر اردو میں Light Essay کو انشائیہ کے نام سے متعارف کرانے کا اہم کام ہی انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انشائیہ کس طرح افسانہ، مقالہ یا ظریفانہ مضمون سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں مختلف طرح کے موضوعات ملتے ہیں مگر انداز بیان میں زیادہ فرق دکھائی نہیں دیتا۔ نہ صرف بہار میں بلکہ پوری اردو دنیا میں ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے وہ معروف اور مقبول رہے ہیں۔ ان کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ 'نشاط خاطر' بہت مقبول رہا ہے۔

ہیرو

مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے۔ آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ اچھے آم کی تعریف انہوں نے یوں کی تھی کہ بہت سے ہوں اور خوب بیٹھے ہوں۔ آپ کی پسند اور ناپسند مجھے نہیں معلوم۔ مگر آپ جانتے ہوں گے کہ آم نہ پسند کرنے والوں کو غالب گدھے سمجھتے تھے۔ ہیرو کی پسند کا اظہار کر کے مجھے اس وقت آپ کی شناخت منظور نہیں۔

کھٹے بیٹھے آم کی طرح ہیرو بھی خالصاً دو ہوتے ہیں، مثالی اور موسیٰ۔ اسے اپنے ملک کی خوش قسمتی کہیے ہمارے پھلوں میں جتنی شکل اور سواد کے آم ملتے ہیں، اتنی اقسام کے ہیرو بھی۔ مثال کے طور پر فلمی ہیرو اور تو ہیرو، کلاس کا ہیرو اور بازار کا ہیرو، محلہ کا ہیرو اور میچ کا ہیرو وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیرو کسی جگہ اداکاری کرتا ہے، کہیں بازی، کہیں یہ کامریڈ کہلاتا ہے، کہیں رنگ دار، کہیں سرداری کرتا ہے، کہیں سواری، کہیں اس کا شغل پہلوانی ہوتا۔ اور کہیں عاشقی۔ جہاں زندگی کی علامت ہے وہاں ہیرو ازم کی علت۔ جہاں زندگی کا سوز و ساز ہے، وہاں ہیرو اور کی تب و تاب۔ کوئی جگہ ہیرو سے خالی نہیں۔ ہر دل میں ہیرو و شپ کا جذبہ اور جوع موجود ہے۔

ہیرو طبعاً دو ہوتے ہیں۔ مثالی اور موسیٰ۔ مثالی ہیرو کتابی دنیا میں نشوونما پاتا ہے اور عموماً یہ زائیدہ خیال ہے۔ نامی شعرا اور کہانی کار اس کے خالق ہوتے ہیں۔ اسی کے دم قدم سے اہل قلم کو مقام ابدی نصیب ہوتا۔ نیرنگی زمانہ سے مثالی ہیرو اگر کبھی اس عالم رنگ میں نمودار ہو جاتا ہے تو اس کا قیام اور قیادت معاشرہ کے لیے پڑ ہو جاتی ہے۔ اس کی سرفرازیاں جو اس کی ہیرو ازم کو نادرا الوجود بنا دیتی ہیں اس کے اقوال و اعمال کی زنجی ہیں۔ مرنے کے بعد اس ہیرو کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر انتہاء و توقیر کے نام پر اس کی قدریں بے قدر کی ہیں۔ 'پیراں نمی پرند مریدان می پرانند' کے مصداق اس مرو آہن کے کردار سے زیادہ اس کی ذات کو مرکز رکوع بنالیا جاتا ہے۔ مثالی ہیرو اللہ کا پیارا ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے مقلدین و تابعین خرافات کے ظلم میں ذرہ نور تلاش کرتے رہتے ہیں۔

بعض مثالی ہیرو ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے وقت یا قبل از وقت صفحہ ارض پر نمودار ہو جاتے ہیں اور فکر و

کے عرفان کی ناہمی اور بلاخیز روشنی طبع کی وجہ سے وہ خود آپ شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے برگزیدہ ہیرو کو ارباب قضا و قدر جلد از جلد عالم ہستی سے عالم نیستی میں واپس کر دیتے ہیں۔

مثالی ہیرو کا انجام، خواہ یہ زائیدہ قلم کار ہو یا پروردہ قدرت، عموماً المیہ ہوتا ہے۔ اپنی الم ناک کے باوجود یہ دست فنا سے محروم رہتا ہے۔ مثالی ہیرو کے المیہ کا یہی رخ طرب ناک اور درخشاں ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی ہیرو ازم کلاسیکی بن جاتی ہے۔

عصر جدید کا ہیرو کلاسیکی ہیرو سے زیادہ حوصلہ مند اور فعال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے مزاج اور ماحول کی ہم رنگی ہے۔ لڑکپن سے پہلے اس میں عاشقی کا مادہ اور جوانی سے پہلے حسینوں پر مرنے کا حوصلہ آ جاتا ہے۔ چلتے پھرتے ایجاب و قبول کی خاطر وہ ہمہ وقت اوٹو رکشا بن رہتا ہے۔ اظہار عشق کا مرحلہ ہو یا ترسیل عشق کا مسئلہ۔ وہ ہمیشہ ترقی پسندانہ انداز سے سوچتا اور غیر روایتی طریقہ کار کو اپناتا ہے۔ مثلاً وہ پتنگ بازی یا غزل گوئی نہیں کرتا۔ وہ کبوتر یا ملازمہ کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ مٹھائی یا چٹھی کا بھی قائل نہیں ہوتا۔ رہی مصوری اور افسانہ نگاری تو ان وسائل کا استعمال اس کے لیے امر محال ہے کہ اب افسانہ اور تصویر دونوں تجریدی آرٹ ہو گئے ہیں۔ لازماً سرخ روئی یا زرد روئی کے اعجاب سے بے پروا ہو کر وہ آتش عشق میں بے خطر چھلانگ لگا دیتا ہے کہ میر صاحب فرما گئے ہیں۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور

عصر جدید کے ہیرو کے سفلہ پن پر غصہ کے عوض مجھے ترس آتا ہے۔ آپ بھی میرے ہم خیال ہوں گے کہ اس کی ہیرو ازم کی نامعقولیت دراصل ہمارے نظام تعلیم اور طریقہ تربیت کا ثمرہ ہے۔ غور فرمائیں، اب نہ مکتبی اور بذہی تعلیم ہے اور نہ درس گاہوں میں چٹائی اور چھڑی۔ مخلوط تعلیم اور سیکولرزم کا دار و دورہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے آغاز سے بہت پہلے بچہ کی دنیائے مشاہدہ میں وہ چمک دار رنگیں تصویریں داخل ہو جاتی ہیں جو والدین کے ذوق اور کمروں کی زینت کا ثبوت رہتی ہیں۔ بچہ کی تجسس پسند نظریں ان ماہ پیکر کے عریاں جسم کے جغرافیہ کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ گھر اور باہر، بازار یا تقریب کی کوئی قید نہیں۔ مرٹنے کی دعوت اسے ہر جگہ ملتی ہے۔ وہ جھنسی کہانیاں دیکھتا اور پڑھتا ہے۔ پڑھتا بہت کم ہے کہ دیکھنے سے ہی اسے فرصت نہیں ملتی۔ عمر آتے ہی کالج کی کھلی فضا میں اس کی ہیرو ازم تازہ دم ہو جاتی ہے جو دل پر گزرتی ہے حیوانی عمل سے اس کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ آخرش، بداقبال والدین اور

نامراد اولاد بعد عقیقہ بسیار ایک ہی گھاٹ پر جا لگتے ہیں یعنی آپ کی ہمدردی پر ہائے دل اور ہائے گل دونوں کے لہجہ پر ہوتے ہیں۔

خدا بیٹھے لکھنؤ کے اگلے لوگ کیسے روشن دماغ اور دور بین تھے۔ ان کی نفاست پسندی اور جدت پرستی کا جواب نہیں۔ ادب اور تہذیب کو اس لکھنوی زندہ دلی سے کیا کچھ نہ ملا۔ ریختہ کو ربیختی، قیصر باغ کو راجا اندر کا دربار بنا کر اور بلبل کو مذکر باندھ کر انہوں نے دلی والوں کو نئے مقامات آہ و فغاں سے روشناس کرایا۔ اور تو اور نہایت دور افتادہ ماضی کے ایک تہذیبی مشغلہ کو انہوں نے یوں اپنایا کہ نقل اصل سے دو ہاتھ آگے بڑھ گئی۔ قدیم روم اور یونان کے جری سورماؤں کے قصے آپ نے پڑھے ہوں گے۔ یہ خوں خوار اور گرسنہ درندوں سے کشتی لڑتے، پینترے بدل بدل کر اپنی شجاعت کے مظاہرے کرتے۔ حیات و موت کی کشتی کا یہ روح فرسا تماشا رومی اور یونانی فرماں رواؤں کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اس کشتی سے جاں بازی کا جیسا بھی مظاہرہ ہوتا ہو، پر صاحب ایہ مشغلہ کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری والا ایک طرفہ معاملہ تھا۔

آفریں براہل لکھنؤ! اس رومی روایت کی لکھنوی مذاق نے بیخ کنی کر دی۔ ان کی توجہ سے اس کشتی کی نہ صرف بہیمیت دور ہوئی بلکہ اس میں جدت اور نفاست بھی آ گئی۔ یعنی ایک طرف انہوں نے انسان اور درندوں کی بجائے شیر اور مرغ کی کشتی رائج کی۔ دوسری طرف دو پہلوانوں کو اکٹھا کرے میں اتارنے کے عوض انہیں بیٹھے بیٹھے چوچ لڑانے کا ہنر سکھا دیا۔ کیسا قلب گداز پایا تھا انہوں نے! بھلا درندہ اور دو پایہ کا مقابلہ کیا؟ حیوان دونوں ہی ٹھہرے۔ لکھنؤ کے اگلوں نے مگر ایسے سورما تیار کیے جو پہلوانوں سے 'ہانکے' ہو گئے۔ ایسے مست پہلوان جن کی لنگوٹ اتر گئی اور مونچھ اٹھ گئی! ان کا جسم پہلوانی نہ رہا، پر ان میں کس بل آ گیا۔ دیکھا آپ نے؟ لکھنؤ کے یہ ہانکے بھی دراصل ہیرو کی ایک قسم تھے۔ یہ ہانکے اس عہد کی تہذیبی جاہ و جمال کی مجسم تصویر تھے۔ ان ہانکوں کی ہیر وازم سے مجمع اور مجلس میں باہر نشاط پہنچے لگتی اور بجھے دل بھی کھل جاتے۔

کہتے ہیں، لکھنؤ اسٹیشن سے دو ہانکے بغرض سفر یکے بعد دیگرے ایک ہی ڈبے میں داخل ہوئے۔ ان کی نظریں ملیں۔ جو بیٹھ چکا تھا جم کر بیٹھ گیا جو آیا وہ واپس نہ ہوا کہ ہانکین دونوں کو عزیز تھا۔ گرین روانہ ہوئی۔ مسافر خوش ہوئے کہ ان ہانکوں کی آمد سے خوش وقتی نصیب ہوئی۔ زانو پر زانو رکھے آمنے سامنے سیٹ پر باطمینان بیٹھے دونوں ہانکوں نے اپنی لن ترانی شروع کر دی۔ مسافروں کو اپنے شیوہ و شعارے سے فریفتہ و متوجہ کرتے ہوئے یہ اپنے

اپنے مربی کے بے مثل اعزاز و افتخار پر دون کی ہانکنے لگے۔ ان کے مکالمے پہلے پردے کی بازی کھیلنے لگی۔ پر نچلا کوئی نہیں بیٹھا۔ کچھ دیر بعد اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اتفاق وقت، دونوں ہانکوں کو اسی جگہ پر اترنا تھا۔ اپنی مرصع چھڑی لیے یہ پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ادھر ادھر قلی گھوم رہے تھے۔ ایک ہانکے نے پلے دار آواز سے قلی کو پکارا۔ دوسرے ہانکے نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ سامان ندارد، پھر قلی چہ معنی؟ وہ نہ دیکھے انداز سے اس ہانکے کا جائزہ لینے لگا۔

پہلے ہانکے نے نہایت تمکنت کے ساتھ قلی کی طرف اپنی چھڑی بڑھائی اور کہا: دیکھتا کیا ہے؟ لے یہ چھڑی اٹھا۔ ہانکین کا یہ مظاہرہ دوسرے کو دک دے گیا۔ دل ہی دل میں وہ تلملا گیا، جیسے اس کی کور دب گئی۔ اچانک چھٹی حس نے اسے سہارا دیا۔ اس نے بھی 'قلی قلی' صدا لگائی۔ ایک قلی دوڑ کر آیا۔ پاس آ کر بولا۔ 'نواب صاحب اسامان کہاں ہے؟'

ہانکے نے کام دار صدری کی جیب میں سے نہایت خسر سے دو انگلی داخل کی۔ ٹکٹ نکالتے ہوئے قلی کو حکم دیا۔ 'نواب کے بیچے! لے یہ ٹکٹ اٹھا۔'

آج کا ہیر و ہانکا بھیلانٹیں ہوتا۔ اس کو ہیر وازم کو دیکھنے یا سننے کا جی بھی نہیں چاہتا۔ یہ نہ مثالی ہوتا ہے اور نہ کتابی۔ یہ فصلی ہوتا ہے اور موسم موسم میں تولد ہوتا ہے۔ میں یہ مشاہدہ نہ کر سکا ہوں کہ موسمی ہیر و کی اچھی فصل مناسب فضا کا نتیجہ ہوتی ہے یا نامناسب فضا میں اس کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ پر اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عصری بحران اور انتشار موسمی ہیر و کی نشوونما کے لیے نہایت سازگار ہیں۔ معاملہ تولید میں ان کی آمد یا آورد کا گوشوارہ بنانا اچھے اچھے دانشوروں کے لیے بھی مشکل ہے۔

موسمی ہیر و کھڑے اسٹیم انجن کے بھیکتے دھواں کی طرح اچانک ابھرتا ہے۔ اس کی ہیر وازم کے کارناموں سے شرفاء گھر کے اندر اور سفلاء گھر کے باہر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بلا در دسر اکثریت کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ بامراد ہونے سے پہلے وہ یوں اٹھنے لگتا ہے جیسے یا ملازم یا باش شرٹ پہن کر ملکینی کے ساتھ بازار کو نکلا ہو!

موسمی ہیر و کدو کر لیے کی لتوں کی مانند تیزی سے بڑھتا ہے۔ زیادہ دن تک ہرا بھرا نہیں رہتا۔ کامرانیوں ستر ہوں یا سینکڑوں، یہ جلد اپنے رنگ بدل دیتا ہے۔ توبہ استغفار کر کے یہ زیارت کو نکل جاتا ہے۔ واپسی کے بعد پھر

یہ شرعی ہیرو بن جاتا ہے۔ فتنہ اور فتور کی دنیا سے منھ موڑ کر وہ خیر و خدمت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ روایتی رسوم کے اجر اور چلتے پھرتے عقائد کے راستے پر شرعی ہیرو کا یقین نہایت کامل اور پختہ ہوتا ہے۔ محلہ یا برادری کے ان روشن خیال طلباء کی عقل پر وہ دست تاسف ملا کرتا ہے جو کارخانہ قدرت کو اندھے کی لالچی تصور کرتے ہیں۔ یہ نو عمر دانش دراصل نہایت حساس ہوتے ہیں۔ امت محمدیہ کے زوال و ادبار اور ام ہائے موسیٰ و عیسیٰ کے ظفر اقبال کا راز ان کی کچی فکر و فہم کے لیے ایک پراہم ہوتا ہے شرعی ہیرو کو طلبہ کے اس نشیانیہ نقطہ نظر سے اختلاف رہا ہے۔ اعتراف اسے بھی ہوتا ہے کہ ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر ہے۔ پر اسے یقین ہوتا ہے کہ قیامت قریب ہے۔ نماز پڑھو۔ اللہ کو یاد کرو۔ سب ٹھیک رہے گا۔ یہ ایمان پرور اور ایمان سوز نقابلی بحشیں بڑی دل چسپ ہوتی ہیں۔ مداخلت کیے بغیر اس محاکاتی مناظرے سے لطف اندوز ہونے کا مجھے موقع ملا ہے اور ایسا محسوس ہوا ہے جیسے منا ڈے اقبال کا 'شکوہ' اور محمد رفیع 'جواب شکوہ' خود رفتہ ہو کر سن رہے ہوں۔

لفظ و معنی

ناواقف ہونا	- نہیں جانا
اقسام	- قسم کی جمع
سواد	- مزہ۔ ذائقہ
شغل	- کام
علامت	- نشان، پتہ، سراغ، کھوج، اشارہ
علت	- بیماری، دکھ، سبب، بری عادت، علت
جور	- بھوک
زائیدہ خیال	- خیال کی پیداوار
ابد	- ہمیشہ رہنے والا
قیادت	- لیڈر شپ۔ رہنمائی
اتباع	- پیروی، تقلید، رہنمائی قبول کرنا
صفحہ ارض	- زمین، دنیا

ناہمی	- ناہمی
عالم ہستی	- ہماری دنیا
عالم نیستی	- آخرت، عدم
المیہ	- ٹریجڈی
فعال	- بہت کام کرنے والا، سرگرم
سفلہ پن	- کمینگی، چھچھورا پن
آہ و فغاں	- رونا پیٹنا، نالہ و فریاد
بیخ کنی کرنا	- جڑ کھودنا
بہیمیت	- حیوانیت، وحشی پن
تولد ہونا	- پیدا ہونا
بحران اور انتشار	- بالچل، بکھراؤ
محاکات	- ہانسی بات چیت، ایک دوسرے سے مشابہ ہونا، کسی چیز یا حالت کی نقل کرنا (الفاظ کے ذریعہ منظر نگاری)
ہمد آفاق پر از فتنہ و شر	- پوری دنیا فتنہ و فساد سے بھری ہے
لطف اندوز ہونا	- لطف اٹھانا، مزہ لینا
آپ نے پڑھا	

□ گذشتہ صفحات میں آپ نے سید محمد حسنین کا ایک طریقہ نامہ مضمون 'ہیرو' پڑھا۔ اس میں خیال کی جو آزاد روی اور گفتگویی ہے اس کے سبب اسے انشائیہ کی صف میں رکھا جاتا رہا ہے۔ حسنین صاحب نے ظاہری طور پر ایک عنوان قائم کر کے اس کے ویلے سے بہت سارے پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ ان میں ایسے بھی پہلو ہیں جن کا عنوان سے براہ راست اور سیدھے طور پر کوئی تعلق نہیں ہے مگر انشائیہ نگار بات سے بات پیدا کرتے ہوئے ادھر ادھر بھی نکل جاتے ہیں اور ہم اس آزاد خیالی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

□ مضمون نگار نے اپنی بات مرزا غالب کے تذکرے سے شروع کرتے ہوئے مشہور نکتہ دہرایا ہے کہ مرزا کو آم بہت پسند تھے۔ پھر فوراً ہی آم اور ہیرو میں ایک رشتہ تلاش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ کھٹے اور میٹھے آموں کی طرح ہیرو بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک مثالی اور دوسرے موسمی۔ پھر مختلف قسم کے ہیرو کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ

مثالی ہیرو اور موسمی ہیرو میں کیا فرق ہے۔ اور دونوں پر دنیا میں کیا گزرتی ہے۔

□ مثالی اور موسمی ہیرو کا تذکرہ کرتے ہوئے مضمون نگار موجودہ زمانے کے ہیرو یعنی نوجوانوں کی طرف آتے ہیں اور اس زمانے میں جس طرح نوجوانوں پر عشق کا بھوت سوار ہے اس پر اپنے غصے اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے درس گاہوں کی غلط تعلیم کو ساری برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ نوجوانوں کی اس بے راہ روی کے لیے کچھ ذمہ داری ان کے والدین کی دی ہوئی غلط تربیت کی بھی ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں۔

□ دورِ حاضر کے نوجوان ہیرو کا تذکرہ ختم کرتے ہی مضمون نگار ماضی میں لوٹ جاتے ہیں اور مثالی ہیرو کے طور پر لکھنؤ کے ان زندہ دلوں اور ہانکوں کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے ابتدا میں تو اپنی جاں بازی کے خوب جوہر دکھائے مگر آگے چل کر وہ بھی فضول قسم کے تکلف و رسم و رواج میں مبتلا ہو گئے۔

□ ایک بار پھر مضمون نگار مثالی ہیرو اور موسمی ہیرو کا مقابلہ کرتے ہوئے نئے زمانے کے ان لوگوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو کسی خاص واقعے کے سبب یکا یک نمایاں ہو جاتے ہیں اور اپنی شہرت، عزت یا دولت پر اترا تے ہوئے نمونہ عبرت بن جاتے ہیں۔ اصل میں جو کچھ انہیں ملتا ہے وہ ان کی عام شخصیت سے میل نہیں کھاتا اور ایسا لگتا ہے جیسے مٹاؤے اقبال کا 'شکوہ' یا محمد رفیع 'جواب شکوہ' سارے ہوں۔

□ یہ ساری باتیں پیش کرتے ہوئے مضمون نگار اپنے پڑھنے والوں کی سوچ سمجھ اور ذہنی سطح سے قریب رہتے ہیں اور کوئی ایسی گہری یا علمی بات نہیں کہتے جو سننے والے کے سر سے گزر جائے۔ ہلکے پھلکے تفریحی انداز میں طنز و طراوت کے حربوں سے کام لیتے ہوئے انہوں نے اپنی بات مکمل کر دی ہے جو آپ کو اچھی لگتی ہے۔ اور آپ یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ بات کچھ دیر اور جاری رہتی تو کچھ برانہ ہوتا۔

آپ بتائیے

1. 'ہیرو' کس طرح کا مضمون ہے اور کیوں؟
2. ہیرو کتنی طرح کے ہوتے ہیں؟
3. مرزا غالب اور آم کے ہارے میں مضمون نگار نے کیا لکھا ہے؟
4. مضمون میں لکھنؤ کے ہانکوں کے ہارے میں کون سا واقعہ آپ کو پسند آیا؟
5. موسمی ہیرو عمر کے آخری حصے میں کیا کرتا ہے؟
6. مثالی اور موسمی ہیرو میں کیا فرق ہوتا ہے؟

1. مرزا غالب نے اچھے آم کے بارے میں کیا کہا تھا؟
 (الف) بہت سے ہوں (ب) بہت سے ہوں اور خوب بیٹھے ہوں
 (ج) بہت کم ہوں (د) بہت کھٹے ہوں
2. ہیر و کتنی طرح کے ہوتے ہیں؟
 (الف) دو (ب) تین (ج) پانچ (د) بے شمار
3. لکھنؤ کے دو ہائے کس طرح سفر کر رہے تھے؟
 (الف) ہوائی جہاز (ب) بیل گاڑی (ج) ٹانگہ (د) ریل گاڑی
4. سفر کرنے والے دوسرے ہائے نے قلی کو کیا اٹھانے کے لیے کہا؟
 (الف) اپنا سامان (ب) اپنی چھڑی (ج) اپنا ٹکٹ (د) اپنا جوتا
5. موسیٰ ہیر و کس میزی کے ساتھ بڑھتا ہے؟
 (الف) درخت کی طرح (ب) کدو کرپے کی لٹ کی طرح
 (ج) گناہ کی طرح (د) پھولوں کی طرح

تفصیلی گفتگو

1. سید محمد حسنین کے مضمون کی اہم باتیں اپنی زبان میں لکھیے۔
2. مضمون نگار نے مثالی ہیر و کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے مختصر بیان کیجیے۔
3. مضمون میں موسیٰ ہیر و کو کن کن چیزوں سے مثال دی گئی ہے؟ سمجھا کر بتائیے۔
4. لکھنؤ کے بانکوں کے بارے میں مضمون نگار نے کیا لکھا ہے؟
5. مضمون ہیر و پڑھنے کے بعد آپ نے کیا محسوس کیا؟ اپنے الفاظوں میں لکھیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. سید محمد حسنین کا کوئی اور مضمون تلاش کر کے پڑھئے اور دوستوں سے اس کے بارے میں بات چیت کیجیے۔
2. اپنے استاد سے لکھنؤ کے بانکوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔
3. اپنے دوستوں سے مشورہ کیجیے کہ مثالی ہیر و بننے کے لیے آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

افسانہ

اردو میں مختصر افسانہ مغربی ادب کی دین ہے۔ یہ جدید دور کی پیداوار ہے۔ عصر حاضر میں مصروف رہنے والوں کے لیے مختصر افسانہ، ناول اور داستان سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔

مختلف نقادوں نے اپنے اپنے طور پر افسانے کی تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک نقاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے۔ ایک اور نقاد کہتا ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدت تاثر ہے۔

ایک اچھا افسانہ اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی گوشے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ افسانہ میں جھول ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں چونکہ یہ مختصر ہوتے ہیں۔ لازم ہے کہ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہونا چاہیے۔ کردار بھی ایسے ہوں جو ہماری زندگی اور تجربوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، موضوع، کردار، مکالمہ، منظر کشی، ماحول اور زبان و بیان کی رنگینیاں قابل ذکر ہیں۔

اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر اور انتظار حسین اہم ہیں۔ ان کے بعد اردو میں افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اس فن کو جلا بخشنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

کرشن چندر



کرشن چندر 23 نومبر 1914ء کو وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر گوری شکر بھرت پور اور پونچھ (کشمیر) میں میڈیکل افسر تھے۔ کرشن چندر کی ابتدائی تعلیم پونچھ (جموں کشمیر) میں ہوئی۔ 1930ء کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور گئے اور فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ 1934ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی زبان میں ایم۔ اے کیا اور 1937ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ان کو ملازمت کے بندھن میں جکڑی زندگی پسند نہیں تھی۔ پھر بھی 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں پروگرام اسٹنٹ کے طور پر ملازمت کی۔ ایک سال کے بعد دہلی اور پھر کچھ دنوں کے بعد آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں تبادلہ کر لیا۔ لاہور، دہلی اور لکھنؤ جیسے ادبی مقامات میں رہ کر ان کی زبان اور بیان میں نکھار اور ان کے ادبی ذوق و شوق میں غیر معمولی اضافہ پیدا ہوا۔

کرشن چندر نے ابتدا میں انگریزی زبان میں لکھنا شروع کیا لیکن پھر وہ اردو میں لکھنے لگے۔ 'ہمایوں' اور 'دلی دنیا' میں ان کی کہانیاں شائع ہوئیں اور پھر وہ سدا کے لئے اردو کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے افسانوں کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے افسانوں کو اردو افسانوں میں اضافہ تصور کیا گیا اور کرشن چندر اردو دنیا کے ایک بے حد اہم افسانہ نگار بن گئے۔

لکھنؤ میں قیام کے دوران ہی ان کو شالیمار پکچر ڈی جی کے لئے لکھنے کی دعوت ملی اور وہ استعفا دے کر پونہ چلے گئے پھر بعد میں مستقل طور پر ممبئی میں سکونت اختیار کر لی۔ 1969ء میں حکومت ہند کی جانب سے ان کو پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا اور دوسرے کئی اداروں کی طرف سے بھی ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

کرشن چندر کی تقریباً 80 کتابیں شائع ہوئیں۔ انہوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، ڈرامے، رپورٹاژ اور مضامین تحریر کیے۔ لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایک افسانہ نگار کی ہے۔ ان کے ناولوں میں 'نکست'، 'جب کھیت جاگے'، 'دل کی وادیاں سو گئیں'، ایک گدھے کی سرگزشت، اور آسمان روشن ہے وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ 'نکست' کرشن چندر کا پہلا ناول ہے۔ کرشن چندر بنیادی طور پر ایک رومانی افسانہ نگار تھے۔ ان کی زبان نہایت خوب صورت اور سبک تھی اور اس میں جادو جیسا اثر تھا۔ کرشن چندر اپنی خوب صورت زبان اور معیاری تخلیقات کے لئے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے بڑے ممالک کی اہم زبانوں میں بھی ان کے افسانوں اور ناولوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ 8 مارچ 1977ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہو گیا۔



پورے چاند کی رات

اپریل کا مہینہ تھا۔ بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں اور ہوا میں بریلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آگئی تھی۔ بلند و بالا تنگوں کے نیچے ٹہلیں دوب پر کہیں کہیں برف کے ٹکڑے سپید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے، اور دوب کا رنگ گہرا سبز ہو جائے گا، اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے بادام پکھراج کے لگینوں کی طرح جھلملائیں گے اور نیلگوں پہاڑوں کے چروں سے کہرا دور ہوتا جائے گا اور اس جھیل کے پل کے پار پگڈنڈی کی خاک ملائم بھیڑوں کی جانی پہچانی با آ آ سے جھنجھٹا اٹھے گی، اور پھر ان بلند و بالا تنگوں کے نیچے چرواہے بھیڑوں کے جسموں سے سردیوں کی پلی ہوئی موٹی موٹی گف اون گرمیوں میں کترتے جائیں گے اور گیت گاتے جائیں گے۔

لیکن ابھی اپریل کا مہینہ تھا۔ ابھی تنگوں پر پتیاں نہ پھوٹی تھیں۔ ابھی پہاڑوں پر برف کا کہرا تھا۔ ابھی پگڈنڈی کا سینہ بھیڑوں کی آواز سے گونجا نہ تھا۔ ابھی سسل کی جھیل پر کنول کے چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جھیل کا گہرا سبز پانی اپنے سینے کے اندر ان لاکھوں روپوں کو چھپائے بیٹھا تھا جو بہار کی آمد پر یکا یک اس کی سطح پر ایک معصوم اور بے لوث ہنسی کی طرح کھل جائیں گے۔ پل کے کنارے کنارے بادام کے پیڑوں کی شاخوں پر شگونے چمکنے لگے تھے۔ اپریل میں زمستان کی آخری شب میں جب بادام کے پھول جاگتے ہیں۔ اور بہار کے نقیب بن کر جھیل کے پانی میں اپنی کشتیاں تیراتے ہیں۔ پھولوں کے ننھے ننھے شکارے سطح آب پر رقعات ولزراں بہار کی آمد کے منتظر ہیں۔

پل کے جنگلے کا سہارا لے کر میں ایک عرصے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سہ پہر ختم ہوگئی۔ شام آگئی، جھیل ول کو جانے والے ہاؤس بوٹ پل کی جنگلاخی محرابوں کے بیچ میں سے گزر گئے اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کا قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلتا گیا اور قرمزی سے سرخی اور سرخی سے سیاہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگڈنڈی بھی سو گئی اور پھر رات کے سنا۔ نے میں پہلا تارا کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا کی خنکی تیز تر ہوتی گئی اور ننھے اس کے

بریلے لس سے سن ہو گئے۔

اور پھر چاند نکل آیا۔

اور پھر وہ آگئی۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی، بلکہ پگڈنڈی کے ڈھلان پر دوڑتی ہوئی وہ میرے قریب آ کے رک گئی، اس نے آہستہ سے کہا:

’ہائے‘

اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی، پھر رک جاتی، پھر تیزی سے چلنے لگتی۔ اس نے میرے شانے کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پھر اپنا سر وہاں رکھ دیا اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کا پریشان گھنا جنگل دور تک میری روح کے اندر پھیلتا چلا گیا اور میں نے اس سے کہا:

’سہ پہر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔‘

اس نے ہنس کر کہا: ’اب رات ہو گئی ہے، بڑی اچھی رات ہے یہ۔‘ اس نے اپنا کمر اور ننھا چھوٹا سا ہاتھ میرے دوسرے شانے پر رکھ دیا اور پیسے بادام کے پھولوں سے بھری شاخ جنک کر میرے کندھے پر سوری۔

دیر تک وہ خاموش رہی۔ دیر تک میں خاموش رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنسی، بولی: ’اٹا میرے پگڈنڈی کے موڑ تک میرے ساتھ آئے تھے، کیونکہ میں نے کہا، مجھے ڈر لگتا ہے۔ آج مجھے اپنی سہیلی ریو کے گھر سونا ہے، سونا نہیں ہے، جاگنا ہے۔ کیونکہ بادام کے پہلے شگوفوں کی خوشی میں ہم سب سہیلیاں رات بھر جاگیں گی اور گیت گائیں گی اور میں تو سہ پہر سے تیاری کر رہی تھی ادھر آنے کی۔ لیکن دھان صاف کرنا تھا اور کپڑوں کا یہ جوڑا اکل دھویا تھا آج سوکھنا تھا۔ اسے آگ پر سکھایا اور اماں جنگل سے لکڑیاں چنے گئی تھیں وہ ابھی آئی نہ تھیں۔ اور جب تک وہ نہ آئیں میں مکی کے بھٹے اور خشک خوبانیاں اور زردالو تمہارے لیے کیسے لاسکتی ہوں۔ دیکھو یہ سب کچھ لائی ہوں تمہارے لیے۔ ہائے تم تو جی جی خفا کھڑے ہو۔ میری طرف دیکھو میں آگئی ہوں، آج پورے چاند کی رات ہے۔ آؤ کنارے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور جھیل کی سیر کریں۔‘

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اور میں نے اس کی محبت اور حیرت میں گم پتلیوں کو دیکھا، جن میں اس وقت چاند چمک رہا تھا اور بڑے چاند مجھ سے کہہ رہا تھا: جاؤ کشتی کھول کے جھیل کے پانی پر سیر کرو۔ آج بادام کے پہلے

شگوفوں کا مسرت بھراتیو ہمارے۔ آج اُس نے تمہارے لیے اپنی سہیلیوں اپنے ابا، اپنی مٹھی بہن اپنے بڑے بھائی سب کو فریب میں رکھا ہے، کیونکہ آج پورے چاند کی رات ہے اور بادام کے سپید خشک شگوفے برف کے گالوں کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں بچنے کے دودھ کی طرح امنڈ آئے ہیں۔ اس کی گردن میں تم نے موتیوں کی یہ ست لڑی دیکھی۔ یہ سُرخ ست لڑی اس کے گلے میں ڈال دی اور اس سے کہا: ”تو آج رات بھر جاگے گی۔ آج کشمیر کی بہار کی پہلی رات ہے۔ آج تیرے گلے سے کشمیر کے گیت یوں کھلیں گے، جیسے چاندنی رات میں زعفران کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سُرخ ست لڑیاں پہن لے۔“

چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران چٹلیوں سے جھانک کے دیکھا پھر یکا یک کہیں کسی پیڑ پر ایک بلبل نغمہ سرا ہواٹھی اور کشتیوں میں چراغ جھمکانے لگے اور شگوفوں کے پرے بہتی میں گیتوں کی مدھم صدا بلند ہوئی۔ گیت اور بچوں کے قہقہے اور مردوں کی بھاری آوازیں اور ننھے بچوں کے رونسے کی مٹھی صدائیں چھتوں سے اور زندگی کا آہستہ آہستہ سلگتا ہوا دھواں۔ اور شام کے کھانے کی مہک، مچھلی اور بھات اور کڑم کے ساگ کا نرم نمکین اور لطیف ذائقہ اور پورے چاند کی رات کا بہار آفریں جو بن۔ میرا غصہ ڈھل گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس نے کہا: ”آؤ چلیں جھیل پر۔“

پل گزر گیا۔ پگڈنڈی گزر گئی۔ بادام کے درختوں کی قطار ختم ہو گئی۔ اب ہم جھیل کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں میں مینڈک بول رہے تھے۔ مینڈک اور جھینگڑ اور مینڈے، ان کی بے ہنگم صداؤں کا شور بھی ایک نغمہ بن گیا تھا۔ ایک خواب ناک سمفنی اور سوئی ہوئی جھیل کے بیچ میں چاند کی کشتی کھڑی تھی۔ ساکن چپ چاپ، محبت کے انتظار میں، ہزاروں سال سے اسی طرح کھڑی تھی۔ میری اور اس کی محبت کی منتظر، تمھاری اور تمھارے محبوب کی مسکراہٹ کی منتظر، انسان کے انسان کو چاہنے کی آرزو کی منتظر، یہ پورے چاند کی حسین پاکیزہ رات محبت کے مقدس لمس کی منتظر ہے۔

کشتی خوابانی کے ایک پیڑ سے بندھی تھی۔ جو بالکل جھیل کے کنارے اُگا تھا۔ یہاں پر زمین بہت نرم تھی اور چاندنی کی اوٹ سے چھتی ہوئی آ رہی تھی اور مینڈک ہولے ہولے گارہے تھے اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چومتا جاتا تھا اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آ رہی تھی..... جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے۔ نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو کے صدا گیت گانے لگے اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں میں

دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں اڑنے والے بادل سب مل کر ناچنے لگے۔ پھر کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے کلیوں کی طرح۔ اور گیت بلند ہو ہو کے مدھم ہونے لگے اور ناچ دھیم پڑتا پڑتا رک گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی۔ وہی جھیل کے نرم نرم بو سے۔

میں نے آہستہ سے کشتی کھولی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے چپو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کشتی کو کھے کر جھیل کے مرکز میں لے گیا۔ یہاں کشتی آپ ہی آپ کھڑی ہو گئی۔ نہ ادھر بہتی تھی اور نہ ادھر۔ میں نے چپو اٹھا کر کشتی میں رکھ لیا۔ اس نے پوٹلی کھولی، اس میں سے زردالو نکال کے مجھے دیے۔ خود بھی کھانے لگی۔

زردالو خشک تھے اور کھٹے پیٹھے۔

وہ بولی یہ کچھلی بہار کے ہیں۔

میں زردالو کھا تا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ آہستہ سے بولی:

’کچھلی بہار میں تم نہ تھے۔‘

کچھلی بہار میں میں نہ تھا۔ اور زردالو کے پیڑ پھولوں سے بھر گئے تھے۔ اور ذرا سی شاخ ہلانے پر پھول ٹوٹ کر سطح زمین پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے۔ کچھلی بہار میں میں نہ تھا اور زردالو کے پیڑ پھولوں سے لدے پھندے تھے۔ سبز سبز زردالو۔ سخت کھٹے زردالو جو نمک مرچ لگا کے کھائے جاتے تھے اور زبان سی سی کرتی تھی اور ناک بننے لگتی تھی۔

زردالو کھا کے ہم نے خشک خوبانیاں کھائیں۔ خوبانی پہلے تو بہت میٹھی معلوم نہ ہوتی مگر جب دہن کے لعاب میں گھل جاتی تو شہر و شکر کا مزہ دینے لگتی۔

’نرم نرم بہت میٹھی ہیں یہ۔‘ میں نے کہا۔

اس نے ایک گٹھلی کو دانٹوں سے توڑا اور خوبانی کا بیج نکال کر مجھے دیا: ’کھاؤ، ہادام کی طرح بیٹھا ہے۔‘

’ایسی خوبانیاں میں نے کبھی نہیں کھائیں۔‘

اس نے کہا: ’یہ ہمارے آگلن کا پیڑ ہے۔ ہمارے یہاں خوبانی کا ایک ہی پیڑ ہے۔ مگر اتنی بڑی سُرخ اور

میٹھی خوبانیاں ہوتی ہیں اس کی کہ میں کیا کہوں۔ جب خوبانیاں پک جاتی ہیں تو میری سہیلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

اور خوبانیاں کھلانے کو کہتی ہیں..... کچھلی بہار میں.....‘

اور میں نے سوچا، پچھلی بہار میں میں نہ تھا، مگر خوبانی کا پیڑ آنگن میں اسی طرح کھڑا تھا، پچھلی بہار میں وہ نازک پتوں سے بھر گیا تھا۔ پھر ان میں کچی خوبانیوں کے سبز اور نکیلے پھل لگے تھے۔ ابھی ان خوبانیوں میں گٹھلی پیدا ہوئی تھی اور یہ کچے کھٹے پھل دوپہر کے کھانے کے ساتھ چینی کا کام دیتے تھے۔ پچھلی بہار میں میں نہ تھا اور ان خوبانیوں میں گٹھلیاں پیدا ہو گئی تھیں اور خوبانیوں کا رنگ ہلکا سنہرا ہونے لگا تھا۔ اور گٹھلیوں کے اندر نرم نرم بیج اپنے ذاتے میں سبز باداموں کو بھی مات کرتے تھے۔

خوبانیاں کھا کے اس نے مکئی کا بھٹکا نکالا۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ سنہرا سینکا ہوا بھٹکا۔ اور کر کرے دانے صاف شفاف موتیوں کی سی چلا لیے ہوئے اور ذاتے میں بے حد شیریں۔

وہ بولی: 'یہ مصری مکئی کے بھٹے ہیں۔'

'بے حد میٹھے۔' میں نے بھٹکا کھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی: 'پچھلی فصل کے رکھے تھے، گھڑوں میں چھپا کے۔ اماں کی آنکھ سے اوجھل۔'

میں نے بھٹکا ایک جگہ سے کھایا۔ دانوں کی چند قطاریں رہنے دیں، پھر اس نے اسی جگہ سے کھایا اور دانوں کی چند قطاریں میرے لیے رہنے دیں۔ جنھیں میں کھانے لگا اور اس طرح ہم دونوں ایک ہی بھٹے سے کھاتے گئے۔ اور میں نے سوچا: یہ مصری مکئی کے بھٹے کتنے میٹھے ہیں۔ یہ پچھلی فصل کے بھٹے، جب تو تھی میں نہ تھا۔ جب تیرے باپ نے اہل چلایا تھا کھیتوں میں۔ گوڑی کی تھی، بیج بوئے تھے، بادلوں نے پانی دیا تھا۔ زمین نے سبز سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اُگائے تھے، جن میں تو نے تلائی کی تھی۔ پھر پودے بڑے ہو گئے تھے اور جوا میں جھومنے لگے تھے اور تو مکئی کے پودوں پر ہرے ہرے بھٹے دیکھنے جاتی تھی۔ جب میں نہ تھا۔ لیکن بھٹوں کے اندر دانے پیدا ہو رہے تھے، دودھ بھرے دانے، جن کی نازک جلد کے اوپر اگر ذرا سا بھی ناخن لگ جائے تو دودھ باہر نکل آتا ہے۔ ایسے نرم و نازک بھٹے اس دھرتی نے اُگائے تھے اور میں نہ تھا۔ دھرتی تھی، تخلیق تھی، محبت کے گیت تھے۔ آگ پر سینکے ہوئے بھٹے تھے، لیکن میں نہ تھا۔

میں نے مسرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: 'آج پورے چاند کی رات کو جیسے ہر بات پوری ہو گئی ہے۔' اس نے بھٹکا میرے منہ سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹوں کا گرم گرم نمناک لمس ابھی تک اس بھٹے پر تھا۔

وہ پورے چاند کی رات مجھے اب تک نہیں بھولتی۔ میری عمر ستر برس کے قریب ہے، لیکن وہ پورے چاند کی

رات میرے ذہن میں اس طرح چمک رہی ہے بیسے ابھی وہ کل آئی تھی۔ ایسی پاکیزہ محبت میں نے آج تک نہیں کی ہوگی، اس نے بھی نہیں کی ہوگی، وہ جادو ہی کچھ اور تھا جس نے پورے چاند کی رات کو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یوں ملا دیا کہ وہ پھر گھر نہیں گئی۔ اور ہم محبت میں کھوئے ہوئے بچوں کی طرح ادھر ادھر جنگلوں کے کنارے ندی نالوں پر اخروٹوں کے سائے تلے گھومتے رہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ پھر میں نے اسی جھیل کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا اور اس میں ہم دونوں رہنے لگے۔ کوئی ایک مہینے کے بعد میں سری نگر گیا اور اس سے یہ کہہ کے گیا کہ تیسرے دن لوٹ آؤں گا، تیسرے دن میں لوٹ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک نوجوان سے گھل مل کے باتیں کر رہی ہے۔ وہ دونوں ایک ہی رکابی میں کھانا کھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھ لیا لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی مسرت میں اس قدر مگن تھے کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور میں نے سوچا کہ یہ کچھلی بہار یا اس سے بھی کچھلی بہار کا محبوب ہے، جب میں نہ تھا۔ اور پھر شاید اور آگے بھی کتنی ہی ایسی بہاریں آئیں گی، کتنی ہی پورے چاند کی راتیں، جب محبت ایک فاحشہ عورت کی طرح بے قابو ہو جائے گی اور عریاں ہو کے رقص کرنے لگے گی۔ آج تیرے گھر میں خزاں آگئی ہے جیسے بہار کے بعد آتی ہے۔ اب تیرا یہاں کیا کام۔ اس لیے میں یہ سوچ کر اُن سے ملے بغیر، اسی طرح واپس چلا گیا اور پھر اپنی پہلی بہار سے کبھی نہیں ملا۔

اور اب میں اڑتالیس برس کے بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ میرے بیٹے میرے ساتھ ہیں۔ میری بیوی مر چکی ہے لیکن میرے بیٹوں کی بیویاں اور ان کے بچے میرے ساتھ ہیں اور ہم لوگ سیر کرتے کرتے سمل جھیل کے کنارے آ لکے ہیں اور اپریل کا مہینہ ہے۔ سہ پہر سے شام ہوگئی ہے اور میں دیر تک ہل کے کنارے کھڑا دام کے بیڑوں کی قطاریں دیکھتا جاتا ہوں اور خنک ہوا میں سفید گوشوں کے گچھے لہراتے جاتے ہیں اور پگڈنڈی کی خاک پر سے کسی جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک حسین دوشیزہ لڑکی ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دبائے ہل پر سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے اور میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ دور پار جنگوں سے پرے ہستی میں کوئی بیوی اپنے خاوند کو آواز دے رہی ہے، وہ اسے کھانے پر بلارہی ہے۔ کہیں سے ایک دروازہ بند ہونے کی صدا آتی ہے اور ایک روتا ہوا بچہ یکا یک چپ ہو جاتا ہے۔ چھتوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پرندے شور مچاتے ہوئے ایک دم درختوں کی گھنی شاخوں میں اپنے پر پھڑپھڑاتے ہیں اور پھر ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ ضرور کوئی ماٹھی گارہا

ہے اور اس کی آواز گونجتی گونجتی افق کے اُس پار گم ہوتی جا رہی ہے۔

میں پل کو پار کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ میرے بیٹے اور ان کی بیویاں اور بچے میرے پیچھے آرہے ہیں، الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہاں پر بادام کے پیڑوں کی قطار ختم ہوگئی، تلہ بھی ختم ہوگیا۔ جھیل کا کنارہ ہے۔ یہ خوبانی کا درخت ہے، لیکن کتنا بڑا ہوگیا ہے۔ مگر کشتی، یہ کشتی ہے مگر کیا یہ وہی کشتی ہے۔ سامنے وہ گھر ہے۔ میری پہلی بہار کا گھر، میری پورے چاند کی رات کی محبت۔

گھر میں روشنی ہے بچوں کی صدائیں ہیں۔ کوئی بھاری آواز میں گانے لگتا ہے۔ کوئی بڑھیا اسے چیخ کر چپ کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، آدھی صدی ہوگئی۔ میں نے اس گھر کو نہیں دیکھا۔ دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ میں گھر کے اندر چلا جاتا ہوں۔

بڑے اچھے پیارے بچے ہیں۔ ایک جوان عورت اپنے خاوند کے لیے رکابی میں کھانا رکھ رہی ہے، مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ دو بچے لڑ رہے تھے، مجھے دیکھ کر حیرت سے چپ ہو جاتے ہیں۔ بڑھیا جو ابھی غصے میں ڈانٹ رہی تھی، ختم کے پاس آسکے کھڑی ہو جاتی ہے، کہتی ہے: 'کون ہو تم؟'

میں نے کہا: 'یہ میرا گھر ہے۔'

وہ بولی: 'تمہارے باپ کا ہے۔'

میں نے کہا: 'میرے باپ کا نہیں ہے، میرا ہے۔ کوئی اڑتالیس برس ہوئے، میں نے اسے خریدا تھا۔ بس اس وقت تو یونہی میں اسے دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ آپ لوگوں کو نکالنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ یہ گھر تو بس کچھ اب آپ ہی کا ہے۔ میں تو یونہی.....' میں یہ کہہ کر لوٹنے لگا۔ بڑھیا کی انگلیاں سختی سے ختم پر جم گئیں۔ اس نے سانس زور سے اندر کو کھینچی۔ بولی: 'تو تم ہو..... اب اتنے برس کے بعد کوئی کیسے پہچانے.....'

وہ ختم سے لگی دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نیچے آگن میں چپ چاپ کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنس دی، بولی: 'آؤ میں تمہیں اپنے گھر کے لوگوں سے ملاؤں..... دیکھو، یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ اس سے چھوٹا ہے، یہ بڑے بیٹے کی بیوی ہے۔ یہ میرا بڑا پوتا ہے، سلام کرو بیٹا۔ یہ پوتی..... یہ میرا خاوند ہے۔ شش اسے جگاؤ نہیں۔ پرسوں سے اسے بخار آ رہا ہے۔ سونے دوا سے.....'

وہ بولی: 'تمہاری کیا خاطر کروں۔'

میں نے دیوار پر کھوئی سے ٹنگے ہوئے لکٹی کے پھٹوں کو دیکھا، سینکے ہوئے پھٹے سنہرے موتیوں کے سے غاف دانے۔

ہم دونوں مسکرا دیے۔

وہ بولی: 'میرے تو بہت سے دانت جھڑ چکے ہیں، جو ہیں بھی وہ کام نہیں کرتے۔'

میں نے کہا: 'یہی حال میرا بھی ہے۔ پھٹنا نہ کھاسکوں گا۔'

مجھے گھر کے اندر گھسنے دیکھ کر میرے گھر کے افراد بھی اندر چلے آئے تھے۔ اب خوب گہما گہمی تھی۔ بچے ایک دوسرے سے بہت جلد گھٹل مل گئے۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر چلے آئے۔ آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے چلے گئے۔

وہ بولی: 'میں نے چھ برس تمہارا انتظار کیا۔ تم اس روز کیوں نہیں آئے؟'

میں نے کہا: 'میں آیا تھا، مگر تمہیں کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔'

'کیا کہتے ہو؟' وہ بولی۔

'ہاں تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں، ایک ہی رکابی میں اور وہ تمہارے منہ میں اور تم اس کے منہ میں لقمے ال رہی تھیں۔'

وہ اک دم چپ ہو گئی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

'کیا ہوا؟' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ بولی: 'ارے وہ تو میرا سا بھائی تھا۔'

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ 'وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اسی روز تم بھی آنے والے تھے۔ وہ واپس

جار ہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا کہ تم سے مل کے جائے۔ تم پھر آئے ہی نہیں۔'

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ چھ برس میں نے تمہارا انتظار کیا۔ مگر تم نہیں آئے۔ پھر میں نے شادی کر لی۔

دو بچے باہر نکل آئے۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچہ دوسری بچی کو لکٹی کا پھٹا کھلا رہا تھا۔

اس نے کہا: 'وہ میرا پوتا ہے۔'

میں نے کہا: 'وہ میری پوتی ہے۔'

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے جھیل کے کنارے کنارے دور تک چلے گئے۔ زندگی کے دو خوبصورت مرقعے۔
 دیر تک انہیں دیکھتے رہے۔ وہ میرے قریب آگئی۔ بولی: 'آج تم آئے ہو تو مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے اب اپنی
 زندگی بنالی ہے۔ اس کی ساری خوشیاں اور غم دیکھے ہیں۔ میرا ہر ابھرا گھر ہے۔ اور آج تم بھی آئے ہو، مجھے ذرا بھ
 بُرا نہیں لگ رہا ہے۔'

میں نے کہا: 'یہی حال میرا ہے۔ سوچتا تھا زندگی بھر تم سے نہیں ملوں گا۔ اسی لیے اتنے برس ادھر کبھی نہیں
 آیا۔ اب آیا ہوں تو رقی بھر بھی بُرا نہیں لگ رہا۔'

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ بچے کھیلتے کھیلتے ہمارے پاس واپس آ گئے۔ اس نے میری پوتی کو اٹھالیا، میں
 اس کے پوتے کو، اس نے میری پوتی کو چوما، میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے
 دیکھنے لگے۔ اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت اور مسرت سے کہہ رہا تھا: 'انسان مر جاتے ہیں
 لیکن زندگی نہیں مرتی، بہار ختم ہو جاتی ہے لیکن پھر دوسری بہار آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں لیکن
 زندگی کی بڑی عظیم سچی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے، وہ بہار میں نے دیکھی، اس سے
 بہار میں تم نہ ہو گے، لیکن زندگی بھی ہوگی اور محبت بھی ہوگی اور خوب صورتی اور رعنائی اور مصوویت بھی۔
 بچے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ سے کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت
 قریب چلے گئے، جہاں کشتی بندھی تھی۔

میں نے پوچھا: یہ وہی درخت ہے۔
 اس نے مسکرا کر کہا: 'نہیں یہ دوسرا درخت ہے۔'

لفظ و معنی

نکھی	-	سردی، ٹھنڈک
لطافت	-	نرمی، نزاکت، عمدگی
دوب	-	گھاس
ٹیگ	-	پھاڑکی چوٹی، ٹہندی
گھرا	-	دھند، کمر، وہ بخارات جو سردی کے موسم میں صبح اور رات کو دھند پیدا کر دیتے ہیں۔

کسی چیز کا بالائی حصہ	سطح
جاڑا، سردی کا موسم	زمستان
خاندان، گھرانہ، حسب نسب، گوتہ بھی استعمال ہوتا ہے۔	گوت
بے غرض	بے لوث
ایک خاص قسم کی کشتی جو کشمیر کی جھیلوں میں استعمال کی جاتی ہے۔	شکارا
ناچ، رقصاں بہ معنی ناچتا ہوا	رقص
کانپنا، لرزاں بہ معنی کانپتا ہوا	لرزا
پتھر لی زمین یا پہاڑی علاقہ سنگلاخی کنایہ مشکل، دشوار	سنگلاخ
آسمان کا کنارہ۔ جمع آفاق	افق
کاندھا، مونڈھا، ایک معنی کنگھی بھی ہوتا ہے۔	شانہ
خوشی، شادمانی، انبساط	مسرت
کھرنی سے پودوں کے چاروں طرف کی مٹی کو پیچے اوپر کرنا، گونڈنا اسی کو گونڈنا بھی کہتے ہیں۔	گوڈی کرنا
کھیت میں سے گھاس پھوس صاف کرنا۔	ٹلائی کرنا
رد آلو، ایک قسم کا پھل	خوبانی
کسی چیز کو چھونے کا احساس، مس کرنا	لمس
لال، سرخ رنگ، قرمز بیڑ، بھوٹی کی مانند ایک کیترا	قرمزی
کلی، بن کھلا پھول، شگوفہ چھوڑنا ایک محاورہ ہے، مراد انوکھی بات	شگوفہ
بے غرض، بغیر کسی فائدے کے کوئی کام کرنا۔	بے لوث
بیچ، درمیان	مرکز
منہ	ذہن
تصویروں کی کتاب، البم	مرقع
فکرت دینا	مات دینا
کچھت میں اناج رکھنے کی جگہ	کھلیان

عظیم - بڑا، کلاس
تھم - کھبا، کیلے کے پھڑکاتا

آپ نے پڑھا

□ یہ افسانہ کشمیر کی حسین درگاہیں سرزمین کی ایک خوب صورت داستان ہے۔ اس افسانے میں بہاروں کی سرزمین کشمیر کی حسین وادیوں، پہاڑوں اور جھیلوں کا ذکر ہے۔ پھولوں، حسین پودوں اور خوبانی کے درختوں کے علاوہ ہری بھری خوش نما گھاس اور برف سے ڈھکی پہاڑوں کی چوٹیوں کی منظر نگاری ہے، ساتھ ہی دو معصوم دلوں کی درد بھری ایک داستان بھی ہے۔

□ اس افسانے کو بیان کرنے والا ایک بوڑھا شخص ہے جو کبھی ایک لڑکی سے بہت پیار کرتا تھا، لڑکی بھی اس کو بہت چاہتی تھی۔ لیکن ایک غلط فہمی کی بنیاد پر دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں اور پھر 48 برس کے بعد ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے، جب وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو پہلی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں پاتے ہیں، اس لیے کہ دونوں ہی بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ لڑکا دادا بن چکا تھا اور کہانی کی لڑکی بھی اپنے باقی پوتوں کو کھلا رہی تھی۔

□ بوڑھی عورت جب اپنے ماضی کے خوابوں کے شہزادہ بوڑھے مرد کو پہچان جاتی ہے تو اس سے اپنی درد بھری آواز میں یہ کہتی ہے: 'اب اتنے برس کے بعد آئے ہو تو کوئی کیسے پہچانے؟ میں نے چھ برس تمہارا انتظار کیا تم کیوں نہیں آئے؟'

بوڑھا مرد جواب دیتا ہے: 'میں آیا تھا مگر تمہیں ایک دوسرے نو جوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا، اس روز تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں، ایک ہی رکابی میں۔'

□ بوڑھی عورت ایک دم چپ ہو جاتی ہے اور پھر زور زور سے ہنسنے لگتی ہے، پھر کہتی ہے: 'ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا۔' کرشن چندر نے اس افسانے میں قدرتی مناظر کو بہت خوب صورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ الفاظ بھی بہت سادہ اور عام فہم استعمال کیے گئے ہیں۔

□ افسانے کے آخر میں خوبانی کا دوسرا درخت ایک علامت کے طور پر دکھایا گیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زندگی اور محبت دونوں میں ایک تسلسل ہے، ایک روانی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ایک چیز اگر جاتی ہے تو کوئی دوسری چیز فوراً اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

آپ بتائیے

1. کہانی بیان کرنے والے شخص کی ملاقات، لڑکی سے جب ہوئی تو وہ انگریزی سال کا کون سا مہینہ تھا؟
2. لڑکی لڑکے کے لیے کھانے کی کیا چیزیں لائی تھی؟
3. خوبائیاں کھانے کے بعد لڑکے اور لڑکی نے اور کیا کھایا تھا؟
4. لڑکی کے ساتھ ایک ہی رکابی میں کھانے والا لڑکا رشتے میں لڑکی کا کیا لگتا تھا؟
5. کہانی بیان کرنے والا لڑکا جب اچانک غائب ہو جاتا ہے تو لڑکی نے کتنے سالوں تک انتظار کرنے کے بعد اپنی شادی کی تھی؟

مختصر گفتگو

1. پل کے کنارے کنارے کس پھل کے پتے تھے؟
(الف) خوبائی (ب) اخروٹ (ج) بادام
2. لڑکی جب لڑکے سے ملنے آ رہی تھی تو اس کے والد اسے چھوڑنے کہاں تک آئے تھے؟
(الف) جھیل تک (ب) مڑک تک (ج) پگڈنڈی تک
3. لڑکی کے گھر کے آگن میں کس پھل کا پتہ تھا؟
(الف) انار کا (ب) خوبائی کا (ج) سیب کا
4. لڑکی اور لڑکے نے مل کر ساتھ ساتھ کتنے پتے کھائے تھے؟
(الف) ایک (ب) تین (ج) دو
5. لڑکا 48 سال کے بعد جب لڑکی سے ملنے گھر میں داخل ہوتا ہے تو ایک جوان عورت اپنے خاوند کو کھانا دے رہی تھی، وہ جوان عورت لڑکی کی کون تھی؟

(الف) ماں (ب) بہو (ج) بہن

تفصیلی گفتگو

1. کرشن چندر نے تقریباً کتنی کتابیں لکھیں؟ ان کے پہلے ناول کا کیا نام ہے؟ ان کے چند دوسرے مشہور ناولوں کے نام بھی تحریر کریں۔



2. کرشن چندر نے وکالت کا امتحان کس سن میں پاس کیا تھا؟ اور کس یونیورسٹی سے؟

3. اپنی ملازمت کے سلسلے میں وہ کن شہروں میں مقیم ہوئے؟

4. کرشن چندر کو حکومت ہند کی جانب سے کس اعزاز سے نوازا گیا تھا اور کیوں؟

5. کرشن چندر کے والد کا نام کیا تھا؟ ان کی وفات کس شہر میں ہوئی اور کب؟

6. جب کرشن چندر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازمت کر رہے تھے تو ان کو قلم میں کام کرنے کے لیے کس قلم کیپنی نے

دعوت دی تھی اور وہ لکھنؤ سے کہاں چلے گئے تھے؟

آئیے، کچھ کریں

1. اردو زبان قومی ایکٹ کی ایک خوب صورت علامت ہے، اس کے فروغ میں غیر مسلموں نے بہت اہم کردار ادا کیا

ہے۔ چند غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے نام تحریر کریں۔

2. کرشن چندر کے کچھ اور افسانوں کا مطالعہ کیجیے اور اپنے دوستوں کے ساتھ ان پر تبادلہ خیال کیجیے۔

شکیلہ اختر

اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر سب سے ممتاز اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔
وہ نے برصغیر ہندوپاک میں اپنی ایک شناخت قائم کی اور ریاست کی دوسری خواتین افسانہ نگاروں کو بھی ایک حوصلہ عطا کیا۔ شکیلہ
نے باضابطہ طور پر افسانہ نگاری سے پہلے ادب لطیف جیسے نثر پارے تحریر کیے اور شاعری بھی کی۔ لیکن ان کا میلان طبع افسانہ نگاری
کی طرف زیادہ تھا۔ لہذا اس میدان میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں اور لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

شکیلہ اختر کی کہانیوں میں عام طور پر متوسط مسلم گھرانے کا ماحول ملتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے حالات و کوائف کو بہت سلیقے
و رزینے سے پیش کرنے کا ہنر جانتی تھیں۔ ان کے یہاں غایت درجے کی دروں بنی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گہری داخلیت کی
بادوں پر ان کے متعدد افسانے اردو کی دوسری معروف افسانہ نگاروں سے ممتاز تر ہیں۔ شکیلہ اختر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی
ت کے کرب کو وسعت دے کر ہمہ گیر بنادینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھیں۔

شکیلہ اختر گیارہ سال کے ارول گاؤں میں 16 اگست 1916 کو پیدا ہوئیں۔ بعد میں ارول جہان آباد ضلع کا حصہ ہو گیا اور اس
ضلع ارول کو خود ضلع کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ سون ندی کے ساحل پر بسا ہوا ارول ایک خوب صورت اور مشہور قصبہ ہے۔ یہاں شاہ
رفیق صاحب کا گھرانہ معزز اور ذی ثروت گھرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہ محمد رفیق صاحب شکیلہ اختر کے والد تھے۔

شکیلہ اختر کا پہلا افسانہ 'رحمت' ہے جو 1936 میں 'ادب لطیف' میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کے ۶ مجموعے شائع ہو چکے
ہیں۔ درپن، آنکھ بھولی، ڈائن، آگ اور پتھر، ابو کے مول، آخری سلام۔ انہوں نے 'شکے کا سہارا' کے نام سے ایک ناول بھی تحریر کیا۔
شکیلہ اختر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے تمام افسانوں میں انہوں نے افسانے کے روایتی انداز کو قائم رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں ماجرا
مازی، کردار نگاری اور بھرپور فضا آفرینی ہر جگہ ملتی ہے۔ عورتوں کی نفسیات پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

شکیلہ اختر نے تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی اور باضابطہ طور پر کبھی اسکول اور کالج میں نہیں پڑھا۔ ان کو ادبی خدمات کے لیے
مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیوں نے اعزازات و انعامات سے نوازا۔ آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی مشاورتی کمیٹی اور بہار اردو اکادمی کی
پریس عاملہ کی ممبر بھی رہیں۔ 10 فروری 1994 کو ان کا انتقال ہو گیا۔

شاید

ستمبر کا مہینہ تھا۔ بارش نہایت زور شور سے ہو رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں حسرت سے کبھی آسمان کی طرف اٹھتیں اور کبھی زمین کی طرف۔ مگر سوائے پانی کے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ 13 ستمبر کو اتنی بارش ہوئی کہ اس کے خیال سے اب بھی دل کانپ جاتا ہے۔ کچی سڑکوں کا کیا پوچھنا۔ پختہ سڑکوں کا میلوں تک پتہ نہ چلتا تھا۔ اور ڈاک کی آمد و رفت تو مدت ہوئی بند ہو چکی تھی ہر طرف سے مکانوں کے گرنے کی ہیبت ناک صدائیں بلند ہو رہی تھیں بارش کے ساتھ ہی یہ غضب ہو گیا کہ دریائے بھی بڑے زور شور سے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور 13 ستمبر کی رات غضب ناک شیرنی کی طرح مھلگو نری اُبل پڑی۔ غریبوں کی جھونپڑیوں کا کیا کہنا بڑی بڑی کوشیوں کی مستحکم بنیادیں ڈگر گانے لگیں۔ ایسی بارش اور ایسی طغیانی تھی کہ ریلوے لائن بھی اس کی قوت میں نہ ہو سکی۔ آخر خدا خدا کر کے پانی تو مگر کب؟ جب سینکڑوں مکانات پیوند زمیں ہو چکے تھے۔ آبادیاں ویرانوں میں منتقل ہو چکی تھیں اور جب خوش حال گھرانے مٹھی بھر چاول اور چنے کی طرف بھوکے کتوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

اب بارش ختم ہو چکی تھی اور ندی بھی تھم گئی تھی۔ (مصیبت زدہ غریبوں کے سوا دنیا پھر اپنی جگہ پر بدستور تھی شام کا وقت تھا۔ میں خطوط لکھنے میں بے طرح مشغول تھی کہ ایک آواز، ایک دل دوز آواز نے مجھے چوٹ کا دیا۔ بیٹی!..... پانچ دن سے..... مسلسل پانچ روز سے ہم بھوکے ہیں۔ آہ! میرے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی پانچ دن سے ایک ایک دانہ کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

میں نے گھبرا کر دیکھا تو میرے سامنے ہی ایک شریف صورت ادھیڑ عمر کی عورت میلی چادر میں لپٹی کھڑی تھی، میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ 'آپ کہاں سے آئی ہیں؟'

میرے اس سوال سے وہ پھوٹ پڑی اور بولی۔ 'میرا گھر؟..... آہ! اب کہاں.....! سب کچھ تو ہوا مگر!..... بچے! میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ وہ کہاں رہ گیا؟' اس نے اشک آلود نظروں سے مجھے دیوانہ وار گھورتے ہوئے کہا۔ 'میں سوئی کی رہنے والی ہوں۔ مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ سبھی کچھ میسر تھا۔ مگر اب کچھ بھی نہیں۔ ظالم طغیانی نے سے میرا سب کچھ چھین لیا!..... میرا گھر!..... میرا معصوم بچہ! میرا منور! ہائے اس کو مجھ سے کیوں لے لیا؟ منور!

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرادل بھی بھر آیا۔ اور آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔

وہ کہنے لگی۔ 'ستمبر کی رات کو ہم لوگ اپنے گھر میں آرام سے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ میرادل دھڑک رہا تھا۔ مگر اتنا بے چین نہ تھا جتنا آج ہے۔ میرے بچے ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ میری نئی بہو گھر کے انتظام میں لگی ہوئی تھی اور میں نماز پڑھ رہی تھی۔ سویرے ہی سنا تھا کہ پھلگو ندی بڑے زور سے بڑھ رہی ہے۔ میں نماز میں مشغول تھی۔ مگر بادل کی گرج سے دل دہل رہا تھا۔ دفعتاً بڑے زور کا ایک دھماکا ہوا اور میرے صحن کی دیوار چور چور ہو کر صحن کے پانی میں گھل مل گئی۔ میں نے نماز ختم کر کے جیسے ہی سلام پھیرا کہ میری نظر مکان میں ریگتے ہوئے پانی پر گئی۔ میں حیران تھی کہ یا اللہ یہ کیسا پانی ہے بارش کا یا ندی کا؟ پانی تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ ہم اس میں بہنے لگے۔ اب ہم ایک دوسرے سے بے خبر بہتے ہوئے ایک نامعلوم اور لامحدود منزل کی طرف چلے جا رہے تھے!..... اس کے بعد میری بچی ا مجھے کچھ خبر نہیں۔ نہ جانے کتنی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ اپنے گاؤں کے رئیس بنگالی بابو کے بچے میں پڑے ہیں۔ جیسے ہی میری آنکھیں کھلیں بے چین ہو ہو کر اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے لگی۔ سب ہی تھے۔ مگر آہ امیرامنور میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر اپنے بچے کو آوازیں دیں دیوانہ وار ہر طرف ڈھونڈنے دوڑی۔ مگر منور امیرا پیارا بچہ نہ ملا۔

اتنا کہہ کر وہ پھر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ اس نے بولنے کی غرض سے منہ کھولا۔ مگر بھوک اور غم کی شدت سے اس کی آواز بہ مشکل نکل رہی تھی۔ 'میرا شوہر اور میرا لڑکا نوکری کے لیے رنگون گیا ہے۔ میری ایک سال کی بیٹی ہوئی بہو امید سے ہے۔ اور میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا نہ کوئی گھر ہے اور نہ در۔ آج اپنی بہتی سے چلے ہوئے پانچ روز ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں میرے بچوں کی غذا صرف وہی دوٹھی چنے تھی۔ دوٹھی چنے اور میرے تین بچے۔ پانچ روز کا سفر۔ میرے اللہ میرے بچے کیسے تڑپ رہے ہیں۔ کاش میرا منور ہوتا اور آج یہ غم دیکھنے کے لیے میں نہ ہوتی۔ وہ اتنا کہہ کر گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے لب کا نپ رہے تھے اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ 'سفر کرتے ہوئے آج پانچ روز ہو گئے۔ اور ابھی ہماری منزل بہت دور ہے۔ میں پٹنہ باقر گنج اپنے میکے لٹی ہوئی جا رہی ہوں۔ وہاں جا کر اپنے بیٹے اور شوہر کو اپنی بربادی کی خبر بھیجوں گی۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ پٹنہ یہاں سے کتنی دور ہے؟'

میں نے کہا۔ 'یہاں سے پلنڈہ کافی دور ہے۔ قریب ۴۰ میل۔ مگر آپ اسٹیمر سے کیوں نہیں جاتیں۔ آج اس کے آنے کا بھی دن ہے۔' میری باتوں کو سن کر وہ تڑپ کر بولی۔ 'اسٹیمر سے جاؤں؟ مگر کرایہ کہاں سے لاؤں؟ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکوں۔ ۴۰ میل میرے بچے کیسے چل سکیں گے؟ یہاں تک تو آتے ہوئے ان کے نازک پیروں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی میں انہیں بہلا پھسلا کر لے ہی آئی۔ اب انہیں سفر پر کیسے آمادہ کروں۔ جب کہ بھوک کی شدت پر بھی وہ سفر کے اختتام کے خیال خام پر خوش ہو کر کھیل رہے ہیں۔' میں نے کچھ پیسے دے کر کہا۔ 'اپنے بچوں کو راستہ میں کوئی چیز خرید کر دیتے گا۔ اور یہ کھانا ہے۔ کھانا آپ خود کھالیں۔' وہ ممنون نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ 'بٹی کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ ایک ماں اپنے ننھے ننھے بچوں کو بھوک میں تڑپتا چھوڑ کر پہلے اپنا پیٹ بھر سکتی ہے۔ تم ماں کی مانتا کو کیا جانو۔ آہ! یہ دل جو اپنے آٹھ سال کے بچے کے غم میں ماتم کر رہا ہے۔ وہی دل آج تمہارے در پر اپنے دوسروں بچوں کے واسطے بھیک لینے کے لیے مجھے گھسیٹتا ہوا بھی لایا ہے۔ لاؤ میں یہ کھانا پہلے اپنے بچوں کو کھلاؤں گی اس کے بعد اگر کچھ بچ رہے گا تو میں بھی کھاؤں گی۔ دیکھو سردی کس بلا کی پڑ رہی ہے اور اس ٹھنڈک میں میرے بچے درخت کے نیچے ٹھہرے ہوئے پڑے ہیں۔' میں نے اسے چادر دیتے ہوئے کہا۔ 'شاید یہ آپ کی کچھ مدد کر سکے۔' اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی اور مکان ہے، جہاں سے وہ کچھ اور مدد حاصل کر سکے۔ میں نے اپنی ملازمہ کے ساتھ اسے ایک مکان میں بھجوا دیا۔

جب وہ وہاں سے آئی تو معلوم ہوا کہ سو بچے ہوئے پیروں اور اشک آلود آنکھوں کو دیکھ کر لوگوں نے تہنیت لگائے ہیں۔ اس نے اپنی دردناک کہانی مختصر پیرائے میں بیان کی۔ جسے سنتے ہی لوگ کہنے لگے۔ 'ہم نے یہ سب ڈھونگ بہت دیکھے ہیں۔ تم ایک کہنہ مشق فریبی ہو۔ کیونکہ واقعی تمارے لب و لہجہ سے بہت کم آدمی تمہیں پہچان سکتے ہیں اور یہ آنسوؤں کی جھڑی تو تمہاری اچھی خاصی مددگار ہے۔ جاؤ وہاں جاؤ، جہاں آنسوؤں کے پردے معصوم عقلوں پر پڑ کر تمہارے فریب کو کارآمد بنا سکیں۔' اس نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'ہاں آج یہ وقت آیا کہ میں دوسروں کی محتاج ہوں۔ مگر مجھے آپ سے شکایت نہیں، گلہ ہے تو اس خدا سے جس نے دنیا کو فریبی بنا کر سچے حق داروں کے حقوق کیوں چھین لیے۔' اس کی یہ باتیں سن کر وہ اور زور سے ہنس پڑے۔ غریب عورت غمگین لہجے میں مجھ سے بولی۔ 'آہ اب لوگ مجھے فریبی کہتے ہیں۔'

وہ جھکی اور میرے دیئے ہوئے کھانے کو اٹھا کر لنگڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ شاید یہ ایک پُر فریب کھیل ہو۔

- افسوس، کسی چیز کے نہ ملنے کا احساس، آرزو، شوق اور ارمان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

- مضبوط، پکا

- دل پر اثر کرنے والا

- آئسو

- آگن

- جس کی کوئی حد مقرر نہ ہو

- خوراک، کھانا

- کچا، کمزور

- دھوکا، دغا

- شکوہ، شکایت

آپ نے پڑھا

□ پہلگو ندی میں طغیانی، سیلاب اور اس کے نواحی علاقوں میں نیز اور مسلسل بارش کے سبب کئی گاؤں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، پوری کی پوری آبادی ویرانے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مکانات منہدم ہو جاتے ہیں اور جھونپڑیوں کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ریلوے لائن کو بھی نقصان ہوتا ہے اور آمد و رفت پوری طرح مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسی طوفانی بارش اور تباہ کن سیلاب سے غریب لوگ تو متاثر ہوتے ہی ہیں امیروں کے گھر بھی محفوظ نہیں رہتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک شریف اور نیک عورت کی درد بھری داستان کو بہت خوب صورت اور پُر اثر انداز میں افسانہ نگار نے پیش کیا ہے۔

□ عورت طوفان اور سیلاب آنے سے قبل ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی اور اُسے کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ وہ اپنے خاندان اور بال بچوں کے ساتھ بہت خوش تھی کہ اچانک اس کی زندگی میں غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ طوفان اور سیلاب نے اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ سیلاب میں اس عورت کا ایک آٹھ سال کا بچہ جس کا نام منور تھا وہ بھی ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس عورت کا شوہر اور ایک جوان بیٹا نوکری کرنے لگے۔ ان لوگوں کے نہ رہنے کی وجہ

سے بالکل تنہا اور بے سہارا ہو گئی تھی۔

□ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں اور جوان بھوکے لے کر کسی طرح سے گاؤں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور پٹنہ جانا چاہتی ہے تاکہ وہاں پہنچ کر وہ اپنے شوہر اور بیٹے کو اپنی تباہی و بربادی کے بارے میں خط لکھ کر بتا سکے۔ لیکن پانچ روز تک پیدل چلنے کے بعد بھی وہ پٹنہ نہیں پہنچ پاتی ہے اور جب بھوک اور پیاس سے وہ مڈھال ہو جاتی ہے تو ایک مکان میں داخل ہو کر اپنی پردرد کہانی ایک دوسری عورت کو سناتی ہے۔ وہ عورت جو مکان کی مالک تھی، نیک اور ہمدرد تھی وہ پریشان حال عورت کو کھانے کے لیے کھانا دیتی ہے اور کچھ پیسے بھی دیتی ہے۔

□ عورت کھانا خود نہیں کھاتی بلکہ اپنے بھوکے بچوں کو کھلا دیتی ہے اور ان بچوں کے لیے ایک چادر بھی طلب کرتی ہے جو اسے مل جاتی ہے۔ تب وہ کہتی ہے کہ کیا کوئی اور مکان ہے جہاں سے وہ کچھ اور مدد حاصل کر سکے؟ نیک عورت جس نے اس کی مدد کی تھی اپنی ملازمہ کے ساتھ اسے ایک دوسرے مکان میں بھیج دیتی ہے جو پڑوس میں ہی تھا۔

□ دوسرے مکان میں جانے کے بعد عورت کا درد اور بڑھ جاتا ہے اور درد کی جگہ پر اس کے خیمے میں صرف طعن و تشنیع آتے ہیں، اسے دغا باز اور فریبی کہا جاتا ہے جس سے عورت کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور اس کا درد سوا ہو جاتا ہے۔ وہ واپس آ کر پہلی عورت کو جس نے اس کی ہر طرح سے مدد کی تھی پوری بات بتاتی ہے اور شکوہ کرتی ہے کہ ان لوگوں نے اسے فریبی کہا۔ لیکن اس کی پوری بات سننے کے بعد وہ نیک عورت بھی خشک بیس جٹلا ہو جاتی ہے اور سوچتی ہے کہ کہیں سب کچھ ایک پُر فریب کھیل نہ ہو اور کہانی اسی مقام پر ختم ہو جاتی ہے۔ سچ کیا ہے اس پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ وہ عورت ایک مظلوم اور بے سہارا عورت بھی ہو سکتی ہے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ شاید وہ فریبی ہو۔

آپ بتائیے

1. کسی ندی میں طغیانی کے سبب سیلاب آیا اور لوگوں کو اپنا گھر اور گاؤں چھوڑنا پڑا۔ اور کیوں؟
2. ستمبر ماہ کی کس تاریخ کو سب سے زیادہ بارش ہوئی تھی اور تیز بارش کی وجہ سے پھلگو ندی کا پانی جب گاؤں میں داخل ہو گیا تھا تو وہ رات کا وقت تھا یا دن کا؟
3. کہانی سننے والی عورت کے گھر میں جب پانی داخل ہو گیا تو اس وقت وہ کس کام میں مصروف تھی؟
4. فرط خوف سے عورت بے ہوش ہو گئی تھی، جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے خود کو کہاں پایا تھا؟
5. کہانی سننے والی عورت کا ایک بچہ سیلاب میں گم ہو گیا تھا، اس بچے کا نام کیا تھا اور اس کی عمر کتنی تھی؟

1. سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لیے عورت نے کیا فیصلہ کیا تھا اور وہ کس شہر میں جانا چاہتی تھی؟
2. عورت کا شوہر اور بڑا بیٹا گاؤں میں رہتے تھے یا کسی شہر میں؟ اگر شہر میں رہتے تھے تو اس شہر کا نام تحریر کریں۔
3. عورت نے کتنے دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا؟ اسے کھانے کے لیے کس نے دیا؟ عورت نے کھانا ملنے کے بعد کیا خود کھانا کھایا؟

4. عورت کو سیلاب کی وجہ سے ہونے والی بربادیوں میں کس چیز کے برباد ہوجانے کا افسوس اور صدمہ سب سے زیادہ تھا؟
5. عورت کا بڑا بیٹا جو رنگون میں ملازمت کرتا تھا اس کی شادی کتنے دنوں قبل ہوئی تھی؟ وہ شہر میں کس کے ساتھ رہتا تھا؟

تفصیلی گفتگو

1. بہار میں شکیلہ اختر کو تمام خواتین افسانہ نگاروں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اپنا خیال تحریر کریں۔
2. شکیلہ اختر کے علاوہ بہار کی چند دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے نام تحریر کریں۔
3. شکیلہ اختر کہاں کی رہنے والی تھیں؟ اس مقام کا نام تحریر کریں، ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ اب وہ جگہ کس ضلع میں واقع ہے؟
4. شکیلہ اختر کے افسانوں کے کل کتنے مجموعے شائع ہوئے؟ ان کے مجموعوں کے نام تحریر کریں۔ (کئی افسانوں کو جب ایک جگہ جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کیا جاتا ہے تو اس کو مجموعہ کہتے ہیں)
5. شکیلہ اختر نے تعلیم کہاں تک حاصل کی تھی اور اس کے والد کا نام کیا تھا؟

آئیے، کچھ کریں

1. مصیبت زدہ عورت جب بد زمانہ کی غرض سے نکلتی ہے تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے فریبی تصور کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہ ہو سکتی ہیں؟ (لفظ وجوہ کی جمع ہے)
2. پوری کہانی پڑھنے کے بعد آپ نے کیا اثر قبول کیا؟ اپنی تباہی و بربادی کا قصہ سنانے والی عورت کیا فریبی تھی؟ یا اس پر غلط فہم کیا گیا تھا؟ اپنے تاثرات قلم بند کریں۔
3. بہار کے چند مشہور افسانہ نگاروں کی تصویر جمع کر کے اپنے اردو کے استاد کو دکھائیں۔

الفانسو داوے

الفانسو داوے فرانسیسی ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ یہ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ان کی پیدائش 1840 میں فرانس کے ایک شہر نائس میں ہوئی۔ انہوں نے طویل ناول اور مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے نثری کارنامے طویل ہیں۔ کئی ناول انہوں نے یادگار چھوڑے ہیں جو فرانسیسی ادبیات میں قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ ناولوں کے علاوہ انہوں نے فرانسیسی افسانے بہت لکھے ہیں۔

ان کے افسانوں میں 'آخری سبق' بھی ہے جو فرانسیسی حب الوطنی سے معمور ہے۔ اس افسانے میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔